پروفیسر کرار حسین - میموریل لیکچر II

نومبر 2001ء

پروفیسر کرار حسین۔ میموریل لیکچر II

شائع کردہ:۔

اہلِ خانہ

B-1 بلاک D-13، گلشنِ اقبال، کراچی۔

فون: 466247, 4964292

غلام کبریا صاحب

خواتین وحضرات میں پیشہ ور انجینئر ہوں اور پیشہ ورانہ طور سے میرا ادب اور تقریروں سے کوئی خاص تعلق نہیں رہا مگر میری ایک خوش قسمتی یہ رہی ہے کہ جب میں علیگڑھ میں داخل ہوا تو میری جن حضرات سے ملاقات ہوئی جن سے میں پھر مستقل وابستہ رہا وہ پروفیسر کرار حسین، ڈاکٹر اختر حمید خان جو دونوں ایک دوسرے کے بہت عزیز دوست تھے اور دو چار ان کے ساتھ کے senior تھے اور ہم ان کے جونیئر یا چیلے کہے جاسکتے ہیں۔ جب میں علیگڑھ میں داخل ہوا تو کرار صاحب اور اختر حمید خاں صاحب خاکسار تحریک سے دونوں وابستہ تھے۔ اختر حمید خان صاحب I.C.S آفیسر تھے اور ان کی بنگال میں تعیناتی تھی۔ لیکن وہ علیگڑھ آتے رہتے تھے اور کرار صاحب میرٹھ میں پڑھاتے تھے مگر قریب قریب ہر اتوار کے دن علیگڑھ میں ہوتے تھے کیونکہ علیگڑھ میں جمعے کی چھٹی ہوتی تھی اور میرٹھ کالج کی اتوار کو چھٹی ہوتی تھی۔ کرار صاحب علامہ مشرقی کی کتابیں پڑھ کے ان کے معتقد ہوئے، اس وقت تک ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ کرار صاحب بنیادی طور سے صوفی تھے اور انہیں علامہ مشرقی میں ایک صوفی کی بڑی جھلک نظر آئی۔ اس کے ساتھ ساتھ اختر حمید خان صاحب ان کے داماد اسی وجہ سے ہوئے کہ وہ بھی ان کو بڑا صوفی ہی گردانتے تھے۔ یہ ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۲ء کے شروع کا واقعہ تھا اس وقت علامہ مشرقی ویلور جیل میں بند تھے۔ کچھ عرصے بعد شاید ۱۹۴۲ء کے آخر میں علامہ مشرقی وہاں سے چھوٹ کر آئے اور علیگڑھ آئے۔ اب ہم سب کو انہیں قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا کچھ دیر ان کو دیکھ کر اور ان سے بات چیت کر کے کچھ کچھ اندازہ یہ ہوا کہ وہ تو فوجی صفت شخص معلوم ہوئے تصوف کا اثر نظر نہ آیا مگر یہ اندازہ یقین میں تب بدلا جب علامہ نے عشاء کی نماز پڑھائی۔ نماز سے پہلے انہوں نے ہمیں یہ بتایا کہ یہ نماز کوئی روحانیت وحانیت نہیں رکھتی یہ تو ایک قسم کی فوجی پریڈ ہے۔ یہ ہم سب کیلئے ایک شاک تھا، بڑا دھچکا لگا یہ سن کر۔ کرار صاحب اور اختر حمید خان صاحب کو جو دھچکا لگا ہوگا وہ ہمیں اندازہ ہے۔ صحیح معلوم نہیں۔ چنانچہ انہوں نے ہمیں یہ بتایا کہ جب میں کہوں اللہ اکبر بس اس وقت اس کو فوجی حکم مانتے ہوئے نیت باندھ لو اور اسی طرح دوسرے عوامل بھی۔ اس کے بعد تو ہمارا جونیئر گروپ بغاوت پر اتر آیا۔

اس وقت تک لفظ ThinkTank ایجاد نہیں ہوتا مگر ہمارا گروپ کام یہی کر رہا تھا۔ ان کے جو لیڈران تھے ان کے ایک طرح کے چیر مین پروفیسر کرار حسین تھے۔ ہم جونیرا گلے دن صبح اپنے سینئروں کے پاس گئے اور

ان سے کہا کہ علامہ تو غلط آدمی ہیں اور نہ صرف اسلام کی غلط تشریح کررہے ہیں بلکہ ہم کو یہ بتارہے ہیں کہ اسلام صرف فوجیں بنانے اور حکومت کرنے آیا تھا اور یہ توجیح ہم کو قابلِ قبول نہیں۔ یہ جو ہمارے لیڈر تھے نوجوان ہی تھے اور ہم سے عمر میں بہت زیادہ بڑے نہیں تھے لیکن تھے تو لیڈر ہی ہم کو بغاوت سے باز رہنے کو کہا مگر ہم لوگ نہیں مانے اور علامہ سے علٰیحدگی کا اعلان کردیا بعد میں معلوم ہوا کہ بغاوت تو ہمارے لیڈروں نے بھی کردی تھی مگر وضعداری کی وجہ سے اظہار نہیں کررہے تھے۔ مگر کچھ ہی دنوں میں وہ بھی اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کرنے لگے اور علامہ کی تحریک سے علٰیحدگی کا اعلان کردیا۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ ہماری بہت سی چھوٹی سی تحریک کا نام غیر ارادی طور سے الامین تحریک پڑ گیا۔ وجہ یہ تھی کہ علیگڑھ سے ہم دو رسالے نکالتے تھے، انگریزی میں ریڈیئنس **(Radiance)** اور اردو میں الامین۔ درحقیقت اس کے کرتا دھرتا اور ایڈیٹر کرار صاحب تھے نام کسی اور کا آتا تھا۔ ہم سب اس وقت تک کچھ نہ کچھ لکھا کرتے تھے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ہم سب تو ان کی سوچ کے مطابق لکھتے تھے اور ان کی سوچ نے ہی ہماری سوچ کو بدل ڈالا تھا۔ ہند میں اس وقت پاکستان کا جوش ایک جنون کی حد تک تھا اور مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ پاکستان بن گیا تو مسلمانوں کے سب مسئلے حل ہوجائینگے۔ مسلمانوں کی لیڈرشپ اگر چہ سوچ سمجھ والی نہیں تھی یعنی دانشور اور **Intellectuals** نہیں تھی مگر ان سب کی متفقہ رائے یہ تھی کہ مسلمانوں کے مسائل دو ہیں، ہندوؤں کی غداری اور انگریزوؤں کی سازش مسلمانوں کا فلسفہ یہ تھا، اس خیال میں پڑھے لکھے لوگ بھی شامل تھے گو کہ بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ علیگڑھ میں ساٹھ ستر فیصد جو پروفیسر تھے وہ اس خیال کے نہیں تھے، وہ اس کے بالکل الٹ خیال کے تھے لیکن طلبہ میں پچانوے فیصد یہی سوچتے تھے۔ تو جب ہماری ان سے بات چیت ہوتی تھی ہمارے ساتھ پڑھتے تھے تو علیگڑھ میں یہ رواج تھا کہ جو اختلاف کرتا تھا اسے غدار نہیں کہتے تھے اس' کریک' کہتے تھے۔ **stupid-stupid** یا بے وقوف کا علیگڑھ میں بدل تھا کریک۔ تو ہم 'کریک' تھے ان کے لئے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ چھوٹے سے ملک کی کمپنی نے آن کے ہمارے ملک میں قبضہ کرلیا غداری ہندوؤں کی ہوئی یا کچھ مسلمان غدار ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جو ہمارے گروپ کے خیال میں خاص طور سے اس کے سربراہ کے خیال میں بڑا نازک وقت تھا اور جب بیٹھ کر سوچا جاتا تھا تو ہم کہتے تھے کہ مسلمانوں کو کیا ہوگیا ہے؟ یہ کیوں دوزخ کی طرف جارہے ہیں چنانچہ **Radiance** میں یہ سب باتیں لکھی جاتی تھیں۔ ہم وہاں یہ بتانے کی کوشش کرتے تھے کہ وہ سلطنت جو پورے برصغیر پر پھیلی ہوئی تھی۔ ایک تجارتی کمپنی قبضہ کرے، سات سمندر کے چھوٹے سے یورپی ملک سے آ کر، اس ملک سے آ کر جو مغل سلطنت کے سب سے چھوٹے سے بھی چھوٹا تھا تو وہ برصغیر ایک بیمار اور پس ماندہ سماج ہی

ہوسکتا ہے اور قبضہ بھی اس طرح ہو کہ وہ تجارتی کمپنی اپنی فوج اسی باشندوں میں سے بھرتی کرے جس میں مسلمانوں کی تعداد الحمداللہ کم نہیں تھی اور اسی ملک پر قبضہ کر لے تو اس میں سازش کا کیا سوال ہے؟ ہم لوگوں کے ذہن میں یہ بات آتی تھی کہ مسلمان یہ کیوں نہیں سوچتے تھے کہ اگر یہ سازش بھی ہے تو ہم جا کر وہاں انگلستان پر قبضہ کر لیں۔ اس سلسلے میں سوچا یہی گیا کہ بھئی مسلمانوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی جائے۔ ہم لوگ تو ناامید ہوتے تھے لیکن کرار صاحب کبھی بھی ناامید نہیں ہوئے اور اختر حمید خاں بھی کم ناامید ہوتے تھے اور دوسرے ہمارے جو لیڈر تھے ڈاکٹر رفیق احمد خاں، پروفیسر عبیداللہ درانی، جناب پروفیسر شمیم احمد وغیرہ یہ کم ناامید ہوتے تھے لیکن کرار صاحب ہمیشہ پرامید رہتے تھے۔ چنانچہ یہ سب باتیں ہم اپنے اخبار ریڈیئنس اور الامین میں لکھتے تھے۔ ہم چار چار پیسے کا اخبار خود جمعہ کی نماز کے بعد بیچا کرتے تھے۔

یاد رہے کہ علیگڑھ میں شیعہ سنی ایک ہی مسجد میں نماز پڑھا کرتے تھے تو وہ اخبار ہم شیعہ، سنیوں سب ہی کے ہاتھ بیچا کرتے تھے اور اب بدقسمتی ہماری یہ ہے کہ وہ ہمارے پاس نہیں ہیں تو ہم ثابت نہیں کر سکتے۔

میں آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مجھ سے کئی دفعہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ پاکستان کی اس حالت سے ناامید نہیں ہوئے، تو میں کہتا ہوں نہیں ہوتے۔ تو وہ پوچھتے ہیں کیوں ناامید نہیں ہوتے؟ دیکھئے میں آپ کو بتانے کی کوشش نہیں یہ کرونگا کہ پاکستان درحقیقت ہندوستان کا سب سے اچھا حصہ تھا اور وہ اس لئے اچھا حصہ تھا کہ میٹرک میں ڈڈلے اسٹیمپ (Dudley Stamp) کے جغرافیے میں پڑھا تھا کہ "Punjab is Greenary of India due to fertiles file in canal network" دوسری باتوں کے علاوہ ایک بات یہ لکھی کہ سندھ، جنوبی پنجاب اور بہاولپور کی ریاست میں جو کپاس پیدا ہوتی تھی اس سے آدھے سے زیادہ ہندوستانیوں کو کپڑے ملتے تھے۔ مشرقی پاکستان جو اب بنگلہ دیش ہو گیا ہے اس کے لئے لکھا تھا کہ اس میں جتنی جوٹ پیدا ہوتی ہے اس کی پانچ فیصد بھی پوری دنیا میں کہیں اور پیدا نہیں ہوتی۔ یہ تو ایک پہلو تھا یہاں کے قدرتی وسائل (Natural Resources) کا۔ پھر یہاں کے کسان محنتی تھے تب ہی تو ہندوستان کے پنجاب کو سارے ہندوستان کا کھلیان بنا دیا تھا۔ دوسری بات جو مجھے اس لئے معلوم تھی کیونکہ میں انجینیئر تھا ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۶ء تک جو لڑائی چلی تو اس وقت انگلستان سے کچھ سامان نہیں آ سکتا تھا اور انگریزوں کو اپنی Munition Factories چلانی تھی اس کے لئے لاہور میں Machine Tools بنائے جاتے تھے اور ان کے مالک بھی مسلمان تھے اور کاریگر بھی مسلمان تھے۔ یہ اکیلا علاقہ تھا جہاں مسلمان آن ٹرپ پرونائیرز

(Entropreneurs) بھی تھے اور اچھے کاریگر بھی تھے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں نے پہلا سنیما دیکھا تو جس پروجیکٹر کے اوپر ہم نے مووی دیکھی وہ لاہور کا بنا ہوا تھا پتہ یہ چلا کہ وہاں لاہور میں ایک شفیع صاحب تھے ان کے کراؤن انجینیر وہ بناتے تھے امریکن کمپنی ویسٹ ریکس ایسٹ (Wester East) ان سے خریدتا تھا اور اس پر اپنی مہر لگا کر بیچ دیتی تھی۔ یہ پاکستان کا سرمایہ تھا، مسلمانوں کا سرمایہ تھا۔

اب ہم جب غور سے دیکھتے ہیں تو اس زمانے میں ہم لوگ اپنے بڑوں کے حکم کے تحت دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالا کرتے تھے۔ جتنے بھی ملک آزاد ہوئے جتنے ملکوں میں جمہوریت آئی ان میں پہلے عوام میں سیاسی شعور پیدا کیا گیا اور سماجی لگاؤ اور سوجھ بوجھ بھی۔ ہم حیران تھے کہ مسلم لیگ کی لیڈرشپ جس میں ہر ایک شامل تھا ان کی کسی تقریر میں یہ نہیں آیا کہ ''مسلمانوں اس لئے تمہاری حکومت چلی گئی کہ تم حکومت کاری نہیں کر سکتے تھے'' ہر ایک کو یہ بڑا فخر تھا کہ مغل سلطنت اپنے زمانے میں دنیا کی تین چار بڑی سلطنتوں میں تھی۔ ہم اس وقت پڑھتے تھے تو ہمیں پتہ چلتا تھا کہ مغل سلطنت میں کوئی فلسفی پیدا نہیں ہوا یا کوئی سائنسدان یا اور کسی مضمون کا اسکالر ہی پیدا نہیں ہوا جو اس وقت فرانس، انگلینڈ اور جرمنی میں پیدا ہو رہے تھے۔ کوئی socialogist پیدا نہیں ہوا حتیٰ کہ کوئی کہانی کار اور لیکھک بھی پیدا نہیں ہوا جس کے لکھے ہوئے ناول ہم پڑھ لیں۔

Think Tank نے یہ دیکھا کہ انگلینڈ نے جب ترقی کرنا شروع کی تو پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ لاطینی زبان ختم کر کے لاطینی Alphabets میں وہ انگریزی جو بولی جا رہی تھی اس کو لکھ کر ادبی زبان میں تبدیل کیا اس لئے نیوٹن اور ملٹن وغیرہ سب پیدا ہوئے۔ انہوں نے انگریزوں کو سیاسی شعور دیا اور سماجی لگن بھی۔ پھر وہاں Middle Class میں انگریزوؤں نے تجارت شروع کی۔ تجارت ایک نیچ کام سمجھا جاتا تھا جیسا کہ آج تک بھی پاکستان میں سمجھا جاتا ہے۔ لیکن وہاں کا جو اوسط طبقہ تھا اس نے تجارت اپنائی اور ایسی اپنائی کے Corporate Culture بنالیا کیونکہ وہ غریب لوگ تھے اور جو یہودی تاجر تھے وہ سب مالدار تھے ان کا مقابلہ کرنے کے لیے سوائے اس کے کوئی طریقہ نہیں تھا کہ لمیٹڈ کمپنیاں بنائیں جن میں بہت سے لوگ تھوڑا تھوڑا سرمایہ ڈال کر اس کے حصے دار یا شئیر ہولڈر بن کر سرمائے کا بھنڈار لگا لیتے تھے تو چنانچہ پہلی لمیٹڈ کمپنی ۱۵۵۳ء میں اکبر کی تخت نشینی سے چار سال پہلے بنی۔ تو یہ وجہ تھی کہ انگریز یہاں بڑی جرات کے ساتھ آئے تھے ان میں سائنسداں تھے تاریخ داں بھی اور فلسفی بھی۔

یہ صحیح ہے کہ مغلوؤں کے یہاں اکبر کے زمانے میں راجہ ٹوڈل مل کا بنایا ہوا ریونیو سسٹم آج تک چل رہا ہے یہ دوسری بات ہے کہ اسے پچھلی صدی میں بدل دینا چاہیئے تھا لیکن بہرحال کچھ نہ کچھ چل رہا ہے۔ ورکس ڈپارٹمنٹ بھی بنایا مگر کوئی تعلیمی شعبہ نہیں بنایا۔ اورنگزیب جوان میں سب سے پڑھا لکھا تھا جب وہ تخت نشیں ہوا تو اس کے استاد نے اس کو خط لکھا کہ اب آپ بادشاہ ہو گئے ہیں مجھے انعام دیجئے۔ تو اورنگزیب نے ان کو لکھا کہ استاد محترم میں بڑی گستاخی کی بات کرر ہا ہوں آپ مجھے معاف فرمادیجئے لیکن آپ نے مجھے کیا پڑھایا ہے؟ قرآن حدیث، عربی زبان، فارسی زبان، مجھے تو یہ نہیں معلوم کہ میرے ملک کا کیا حال ہے، ہمیں آپ نے یہ نہیں بتایا کہ ہمارے پڑوسی ممالک کیسے ہیں کہ ہمارے وسائل کیا ہیں۔ مگر اس اورنگزیب نے سب کچھ تو کہہ دیا مگر یہ نہیں کہا کہ محکمہ تعلیم قائم کردیں، محکمہ تعلیم نہیں بنا چنانچہ جو اس وقت تعلیم کے تین مراکز تھے ٹھٹھہ، ملتان اور جون پور اس میں سب اسکول تھے۔ یہ جو درس نظامی کہا جاتا ہے یہ بھی اورنگزیب کے آخری دور میں، ملاّ نظام نے بنایا تھا جسکا اثر آج کل ہم دیکھ رہے ہیں اس کے تحت جو ہمارے پڑوسی ملک میں ہو رہا ہے، طالبان کا اثر اور ہماری ملک میں مذہبی انتہا پسندی کوئی سلیبس نہیں بنایا جس میں تاریخ، جغرافیہ، سماجیات، سائنس اور دماغ کو بیدار کرنے والے دوسرے علوم ہوتے۔

یہ وجہ تھی کہ ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر مسلمانوں کے لیڈر سلطنت کو یاد کرتے رہینگے یہ نہیں کہینگے کہ صاحب ہم کو تجارت میں آنا چاہیئے، یہ نہیں کہینگے کہ ہم کو کھلا دماغ پیدا کرنا چاہیئے، یہ نہیں کہینگے کہ ہمیں تعلیم حاصل کرنا چاہیئے، بڑا دل پیدا کرنا چاہیئے، اس وقت تک وہ ملک نہیں چل سکتا۔ میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ مجھے یہ مغالطہ نہیں ہے کہ ہندوستانی یہاں سے ذیادہ بہتر ہیں کیونکہ یہ مرض جسے میں کہتا ہوں **Sick, Decadent Indian Mughal culture** ہے وہ بھی اس کے وارث ہیں ہم بھی اسی کے وارث ہیں ہم ذرا بڑے وارث ہیں کیونکہ ہم مسلمان تھے۔

میں یہ سب پس منظر اسلیئے عرض کررہا ہوں کہ اس پس منظر میں کرار صاحب نے ہمیں تربیت دی یہ سب کچھ ہمیں پڑھایا اور یہ سب کچھ ریڈینز میں لکھا یہ وجہ تھی کہ جب مجھ سے کہا کہ آپ ناامید کیوں نہیں ہیں تو میں نے کہا کہ ہمیں کبھی امید بھی نہیں تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ میں ایک اور عرض کرتا ہوں کہ جب ۱۴ اگست کو ہندوستان ٹوٹ گیا تو ہمارا یہ **Think Tank** جمع ہوا اور انہوں نے یہ کہا کہ اب پاکستان بن گیا ہے آج سے ہم اس کے مخالف نہیں ہیں کیونکہ اس وقت تھے جب تک یہ نہیں بنا تھا ہم مخالف تھے، لیکن اب بن گیا ہے اب یہ حقیقت ہے اب اس کو قائم رکھنا چاہیئے۔ چنانچہ یہ طے ہوا کہ ہم لوگ یہاں آئیں۔

آپ نے دیکھا کہ کرار صاحب نے تعلیمی میدان میں جو کیا ان کے ساتھی اختر حمید صاحب نے سماجی میدان میں جو کچھ کیا۔ اب یہ جو اورنگی پائلٹ پروجیکٹ ہے اس کے صدر کرار صاحب تھے اور سیکٹری اختر حمید صاحب تھے۔ کرار صاحب جو تھے وہ فیلڈ ورکر نہیں تھے سوچ ان کی ہوتی تھی کام اور کرتے تھے اور اللہ کے فضل سے اورنگی پائلٹ پروجیکٹ اب بھی چل رہا ہے اور آگے بڑھ رہا ہے۔ ہمیں یہ دعوی نہیں ہے کہ ہم انقلاب لے آئینگے یہ تو جب تک نہیں ہوسکتا کہ سیاسی شعور اور سماجی لگن لوگوں میں پیدا نہیں ہوگا نہیں ہوسکتا۔ ہر ایک کی اپنی اپنی حدود ہیں، ہم یہ کام نہیں کر سکتے تھے مگر اس کے لئے ہر سماجی سیاستدانوں کو یہاں بھی آن کے بتایا کہ یہ کام کرو لیکن نہیں کیا۔ اب صرف یہ دعا کی جاسکتی ہے کہ اللہ پاکستان کو سلامت رکھے اور لوگوں میں سیاسی شعور سماجی بیداری پیدا کرے تاکہ پتہ چلے کہ تم نے جو چالیس ارب ڈالر قرضہ لئے ہیں یہ غلط لئے ہیں اور اس میں جو بڑا بدقسمتی کا پہلو ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے **Founding Fathers** کو معلوم نہیں تھا کہ پاکستان اتنا مالدار ملک ہے چنانچہ یہ جواب میں بات کہنے والا ہوں یہ ریکارڈ پر ہے اور جو واشنگٹن جائے وہ اسے وہاں پڑھ لے، امریکن اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ میں۔ اور جو وہاں نہیں پڑھ سکتا پاکستان میں اس کے **Documents** چھپ چکے ہیں۔ پاکستان میں وہ یہ ہیں کہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو میر لائق علی واشنگٹن گئے اور جو اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے پیپرز میں لکھا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ **"Mir Laik Ali special envoy to the governer general of Pakistan came and presented us this application"** اس میں لکھا تھا کہ ہمارے پڑوسی کمیونسٹ ہیں جو کہ اسلام کے خلاف ہیں اور لیاقت علی خان نے یوں **explanation** دیا کہ اسلام اور **communism** کا یوں ساتھ نہیں ہے کہ اسلام میں ذاتی ملکیت ہمارے ایمان کا حصہ ہے اور **communism** میں ذاتی ملکیت نہیں ہوتی لہذا ہم مسلمان ہیں جو کبھی **communist** نہیں ہونا چاہتے اور ہم نہیں ہونگے۔ یہ بات لیاقت علی خان نے اس وقت کے امریکی وزیر خارجہ مارشل سے کہی۔ جو درخواست اس میں لکھا کہ اگر امریکہ ہمیں دو ارب ڈالر دے گا تو اس کے عوض ہماری فوج کیمونزم کے خلاف اس کی مدد کو حاضر رہے گی۔ یہ دستاویزات، جیسا ابھی میں نے کہا پاکستان میں چھپ چکے ہیں کتاب کا نام **America-Pakistan Relations** ہے اور اس کو ۱۹۸۴ء میں لاہور کے ناشر وینگارڈ **(Vengaurd)** نے چھاپا ہے۔

رونے کا مقام ہے کہ وہ ملک جو **greenary of India** ہو وہ یہ درخواست کر رہا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس

وقت ہمارے پاس کیش نہیں تھا لیکن کیش تو آجاتا ہے، کیش تو پیدا کیا جاتا ہے، کیش اللہ میاں کے ہاں سے تو نہیں آتا، اور میرا خیال ہے کہ بطور کرار صاحب کے چیلے میرا فرض تھا، بطور حمید صاحب کے چیلے میرا فرض تھا کہ جو انہوں نے کہا اور جو میری سمجھ میں آیا ان سب کو لکھ دیا۔ کبھی کبھی میں مذاق میں کرار صاحب اور اختر حمید خاں سے کہتا کہ میں نے کہا میں اپنے بزرگوں کا کفارہ ادا کر رہا ہوں۔ آپ نے لکھ کے نہیں چھوڑا یہ سب کچھ تو میں آپ کی طرف سے لکھ دیتا ہوں تو میں نے لکھ دیا۔ اس مضمون پر میری سات کتابیں چھپ چکی ہیں۔

مگر یہ دین ان ہی بزرگوں کی ہے۔ آپ یہ اندازہ کیجئے کہ جس شخص کے دو اتنے بڑے ساتھی ساٹھ سال کے پرانے ساتھی گذر گئے تو میرے دل پر کیا گذری ہوگی۔ لیکن میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے انہوں نے اتنی self respect دیدی کے میں کسی کے آگے علم کی یا پیسے کی بھیک مانگنے کو تیار نہیں ہوں نوجوانوں کا فرض ہے کہ اس پیغام کو لوگوں تک پہنچائیں۔ اب ایک تبدیلی آرہی ہے اور وہ تبدیلی یہ ہے کہ پہلے ہم یہ بات کرتے تھے تو لوگ کہتے تھے کہ یہ غدار ہیں لیکن اب نوجوان نسل کی سمجھ میں یہ بات آرہی ہے کہ یہ بات سچی ہے اور میں بڑے اعتماد کے ساتھ یہ بات کہتا ہوں کہ باوجود اس کے کہ پاکستان نے سب کچھ کھو دیا، اس کے اوپر چالیس ارب ڈالر کا قرضہ ہے جس کے لئے یہ گروی ہوگیا اب بھی بچایا جا سکتا ہے اگر کوشش کی جائے، محنت کی جائے اور Human Resources کا صحیح استعمال کریں۔ یہاں کے جو کاریگر ہیں ان کا ثانی مجھے نظر نہیں آیا۔ میں نے shop floor worker کے طور سے انگلینڈ اور جرمنی دونوں میں کام کیا لیکن باوجود اس کے کہ ان کو سائنسی لائنوں پر تربیت دی جاتی تھی اور یہ پاکستانی بغیر تربیت کے اتنے بڑے بن جاتے ہیں۔ میں حیران تھا جب میں لاہور میں تھا کہ جو باتیں مجھے انجینئرنگ میں پڑھائی گئیں مجھے معلوم ہوا کہ بدردین صاحب یا حاجی عبدالمجید صاحب جو اردو پڑھے لکھے تھے اور واجبی واجبی صرف پڑھ سکتے تھے انہیں وہ سب باتیں معلوم تھیں اور میں اس وقت حیران رہ جاتا تھا کہ کہاں سے انہیں باتیں آگئیں، میں نے تو کتابوں پڑھی ہیں۔

کرار صاحب کا خواب ہمیشہ یہ رہا کہ پاکستان ایک بہت بڑا اور زبردست ملک بنے اور وہ بھی کبھی ناامید نہیں ہوئے اسلئے میں بھی ناامید نہیں ہوں۔ اللہ سے میں دعا کرتا ہوں کہ کرار صاحب اور اختر حمید خاں صاحب کی روحیں خوش ہوں جب یہ ملک ترقی کرنا دوبارہ شروع کردے اور کسی ملک کا غلام نہ رہے شکریہ۔

پروفیسر جمال نقوی

دوستو---پروفیسر کرار حسین سے عقیدت رکھنے والو!

میری نظر میں کرار صاحب عالم دین کے علاوہ صوفی تھے۔میں حیران تھا اور ہوں کہ میرے جیسا لٹھ کیمونسٹ ان کی کشش کیوں محسوس کرتا ہے۔اس معمہ کو کرار صاحب نے خود ہی حل کیا جب پاکستانی کلچر پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے مذہب کے ادراکِ حقیقت کے طریقہ اور سائنس کے ادراکِ حقیقت کے طریقہ پر تبصرہ کیا۔انہوں نے بتایا کہ ایک صوفی اور دوسرا کیمونسٹ ہے۔اپنے بارے میں انہوں نے کہا: ''میں شاید ان دونوں حصوں کے مابین وہ نقطہ اتصال ہوں جو ممکن نہیں ہے۔'' معلوم ہوا کہ صوفی ہوتے ہوئے وہ کیمونسٹ کے قریب تھے۔میں بھی شاید کیمونسٹ ہوتے ہوئے صوفی سے دور نہیں ہوں اسی لئے کرار صاحب کی کشش محسوس کرتا ہوں۔عام الفاظ میں ان کی روحانیت میں اتنی لبرل ازم اور TOLERANCE (رواداری) تھی کہ ان کی شخصیت سے ہر قسم کا آدمی کچھ نہ کچھ حاصل کرتا تھا۔جناب، میں نے ان کے پاس بیٹھ کر بہت کچھ سیکھا ہے، لیکن سب سے زیادہ یہ سیکھا ہے کہ سائنس کے دو دونی چار کے آگے ہر شخص ایک ایسا معجزہ ہے جس کی گہرائیوں میں اترے بنا کوئی اپنی شناخت نہیں کرسکتا۔

دوستو، صوفی کی شان ہے کہ وہ چیزوں Internalise کرتا ہے جبکہ سیاسی لوگ خارجی تبدیلی کا مشن لے کر چلتے ہیں-کرار صاحب کو مجھ سے یہ شکایت تھی کہ میں ہر صورتحال میں کوئی روشن پہلو تلاش کرلیتا ہوں-وہ مجھے Incorrigible optimist (ناقابلِ اصلاح رجائی) کہا کرتے تھے-ان کو تو یہ شکایت تھی لیکن میں انکی اس بات کو اپنے لئے ایک Compliment سمجھتا تھا-

جلسے کے منتظمین نے مجھے مارکسزم اور مزدور طبقے کی تحریک پر بات کرنے کے لئے کہا ہے-کرار صاحب مارکسزم کو سائنس کے ادراکِ حقیقت کے طریقے کی اعلیٰ مثال سمجھتے تھے-لیکن میں مارکسزم کے ماضیت کے فلسفے سے قطع نظر کرتے ہوئے اس پر مزدور طبقے کے سیاسی نظریہ کے طور پر بات کروں گا-مارکسزم سے برِ صغیر کے لوگ اس وقت متعارف ہوئے جب سجاد ظہیر اور فیض صاحب وغیرہ نوجوان تھے-مارکسزم اور سوشلزم کا سیاسی دھارا اب کمزور پڑ گیا ہے لیکن مارکس فادر آف سوشلزم کے طور پر ویسے ہی امر ہیں جیسے فرائیڈ فادر آف سائیکلوجی کے طور پر امر ہیں۔

مزدور تحریک اور سوشلزم کا کا قصہ کچھ اور ہے۔ انقلابی مزدور تحریک کی معراج ۱۹۱۷ء کا روسی انقلاب تھا جو ۱۹۹۰ء کے قریب اندر سے سنگسار ہو کر بکھر گیا۔ اس واقعہ نے میرے جیسے کیمونسٹوں کو **Spiritral Chaos** (روحانی ابتری) میں مبتلا کر دیا۔ ایک جانی پہچانی دنیا ختم ہو گئی۔ ایک جانا پہچانا سوچ کا انداز بدلنے کی ضرورت پڑ گئی۔ ایک جانی پہچانی دوست اور دشمن کی شناخت تتر بتر ہو گئی۔ اب مجھے اپنے خیالات کے تانے بانے ازسرِ نو ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ میری عمر ستر سال کی ہو رہی ہے۔ پوتوں اور نواسوں کو کھلانے کے دن ہیں۔ لیکن معلوم ہوا کہ انسان کو روٹی کے برابر خیالات کے **Pattern** کی بھی ضرورت ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ کے ساتھ اپنے خیالات **Share** کروں۔ میں نے **Post Cold War World** یعنی ۱۹۹۰ء کے بعد کی دنیا کی **Dynamics** (محرکات) کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ خیالات جیسے بھی ہیں میں آپ کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ ماضی کی تاریخ کی صرف دو مثالوں پر میں آپ سے بات کروں گا۔ ایک روسی انقلاب کی تاریخی اہمیت اور دوئم لینن کی سامراج کی تشریح۔

۱۹۹۰ء میں پیرس کانفرنس نے کولڈ وار کے خاتمے کا اعلان کیا۔ اس سے پہلے کے واقعات تاریخ ہیں اس کے بعد کے بعد کے واقعات **Current Affairs** (حالاتِ حاضرہ) ہیں۔ دو قطبین کی دنیا کے خاتمے کے بعد عالمی نیوکلیائی جنگ کا خطرہ بہت گھٹ گیا اور تخفیفِ اسلحہ کا دور شروع ہوا۔ اس عالمی نیوکلیائی جنگ کے خطرے کے ٹلنے ہی نے شاید مجھے حوصلہ دیا کہ میں اپنے خیالات ازسرِ نو ترتیب دوں۔ گورباچیف کی عظمت دیکھئے کہ انہوں نے اپنے اقتدار کی قربانی دے کر۔ اور خیال رکھئے کہ اکثر لوگوں کو اقتدار زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہوتا ہے۔۔۔۔ دنیا کو نیوکلیائی جنگ کے خطرے سے نجات دلائی۔ گورباچیف کا انسانیت پر یہ احسان ناقابلِ فراموش ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ اب دنیا میں جھگڑے نہ رہے، بلکہ یہ کہ نیوکلیائی جھگڑے کا خطرہ ٹل گیا ہے۔ غیر نیوکلیائی جھگڑے اب بھی ہیں۔ عراق کویت پر چڑھ دوڑا، امریکہ نے عراق پر حملہ کر دیا۔ یوگوسلاویہ میں ٹوٹ پھوٹ، قتل و غارتگری ہے۔ بوسینا اور چیچنیا کا تنازعہ کھڑا ہے۔ نیویارک اور واشنگٹن پر دہشت گردی کے حملے ہوئے ہیں اور اب افغانستان پر بمباری جاری ہے۔ بہر حال، یہ تنازعات کولڈ وار کی دنیا کے ورثے ہیں اب ان کو **Address** کیا جا رہا ہے۔ آئرلینڈ کے تقریباً تین سو برس پرانے مسئلے پر آئرش اور برٹش بات کر رہے ہیں، سابق یوگوسلاویہ اور بوسنیا اور چیچنیا میں عالمی برادری مسائل کے حل کی تلاش میں ہے۔ اسرائیلی اور فلسطینی صرف لڑ نہیں رہے ہیں، مذاکرات بھی کر رہے ہیں۔ کوریا اور قبرص میں مذاکرات جاری ہیں۔ پاکستان اور بھارت کے

درمیان لاہور ڈیکلریشن انہی مذاکرات کی ایک کڑی ہے۔امریکہ میں دہشت گردی اوراس کا ردعمل مزید ثابت کرتا ہے کہ نیوکلیائی ہتھیار نہ ڈیفنس میں کارگر ہیں نہ Offence میں۔ اس سلسلے میں سارک کی اس لائن کو میں درست سمجھتا ہوں کہ Testban کے مسئلہ کو Dismanitling of Arsenal سے ملا کر دیکھنا چاہیئے۔

نئی تشکیل پانے والی دنیا کے سارے خدوخال تو ابھی واضح نہیں ہیں اور لوگ اپنے اپنے طور پر خیال آرائی کر رہے ہیں۔سیموئیل ہنٹگٹن نے نئی دنیا کے تعبیر Clash of Civilization سے کی ہے۔ ان کے فارمولے سے اکثر لوگوں کو شدید اختلاف ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ تہذیبیں ٹکراؤ کی طرف جانے کی بجائے گلوبل ولیج میں Integrate ہو رہی ہیں۔لیکن بقول کرار صاحب کے زندگی اکثر ایسے متضاد معمے پیش کرتی ہے جو بظاہر ناممکن نظر آتے ہیں بہرحال ہنٹگٹن کی مجموعی رائے درست ہو یا غلط، کچھ نکات نظر میں رکھنے چاہیئے۔ ایک یہ کہ ان کا یہ مطلب ہرگز یہ نہیں کہ صلیبی جنگوں کا کوئی نیا سلسلہ شروع ہونے جارہا ہے۔دوئم یہ کہ ان کے اس دعوے کی تردید مشکل ہے Ideological ٹکراؤ کا دور ختم ہوگیا ہے۔تاریخی پس منظر میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ نشاۃ الثانیہ کے دور سے پہلے راجاؤں اور مہاراجاؤں کے ٹکراؤ کا دور تھا جو ساتھ میں مذہبی ٹکراؤ کا بھی دور تھا۔ پھر قومیں وجود میں آئیں۔ اور پھر قوموں کا ٹکراؤ پہلے یورپ اور پھر ساری دنیا میں ہوا۔صنعتی انقلاب کے بعد سرمایہ دارانہ نظریہ اور مزدور طبقے کے سوشلسٹ نظریہ میں ٹکراؤ ہوا جس نے دو قطبین کی دنیا میں ماسکو اور واشنگٹن کے درمیان رسہ کشی کی شکل اختیار کرلی۔سرمایہ دار اور مزدور اب بھی موجود ہیں اور ان میں کشمکش بھی ہے۔لیکن نظریاتی ٹکراؤ ۱۹۹۰ء کے قریب ختم ہوگیا۔

سوئم یہ کہ تہذیبوں کے ٹکراؤ سے ہنٹگٹن کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب جب کہ قومی اور نظریاتی وفاداریوں کا Cushion ختم ہوگیا تو ترقی یافتہ اور پسماندہ کے درمیان Gap یعنی خلاء بہت نمایاں ہوگیا۔ بات صرف دولت یا صنعت کی نہیں ہے بلکہ Life Style کی ہے۔جو معیشتیں تاریخ میں پیچھے رہ گئی ہیں وہ اپنے قبائلی اور خودکفیل معاشرے کو اپنا Ideal سمجھتی ہیں اور ان Ideals کا ترقی یافتہ ممالک کے Life Style اور Ideals سے ٹکراؤ ہے۔بات کو یوں سمجھئے کہ ایک طرف ہمارے اجداد کی طرز زندگی ہے جس کا احترام تو کرتے ہیں لیکن اس کی طرف واپس نہیں جا سکتے۔دوسری طرف ہماری اولادوں اور ان کی اولادوں کی زندگی ہے جو ہمیں زیادہ عزیز ہے۔ماضی کے احترام کے باوجود، نئی نسل کا خواب یورپ اور امریکہ کا ہے نہ کابل اور روایت پرستی کا۔پھر یہ بھی نظر میں رکھنا چاہیے کہ جو لوگ کابل اور بن لادن کے عشق میں مبتلا ہو

گئے ہیں وہ بھی ہمارے ہی بچے ہیں اور ہم ان سے لاتعلق نہیں ہو سکتے۔ ان کا قبلہ درست کرنے، اور اس سے زیادہ ان کی زندگی کی حفاظت کئے بنا ہم نہیں رہ سکتے۔ آخری بات جو غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ ٹکراؤ تو ہے لیکن یہ ٹکراؤ ایک ہی عالمی اور انسانی وحدت میں ہے۔ انسانی وحدت اول ہے اور اس میں ٹکراؤ ثانوی ہے۔ اتحاد اول اور جدوجہد ثانوی ہے۔ کرار صاحب اور صوفیوں کے اس خیال کو نظر میں رکھنا ہوگا کہ ٹکراؤ نفرت نہیں بلکہ محبت کے دائرے میں ہونا چاہئے۔ slaughter کے بجائے قربانی یعنی sacrifice کی شکل میں ہونا چاہئے تا کہ انسانی وحدت مجروح نہ ہو۔

کمیونسٹوں اور جہادیوں کے خلوص پر کون شک کرسکتا ہے۔ لیکن خلوص علم کی ضمانت نہیں دیتا۔ لینن کو بے خداؤں کا خدا کہا گیا ہے۔ لیکن جب وہ سامراج کو سرمایہ داری کی آخری منزل یعنی last stage بتلاتے ہیں imprialisam is the highest stage of capitalism تو وہ ایسی قیاس آرائی کررہے ہیں جس کو وقت نے ثابت نہیں کیا۔ امپیریلزم کا سیلاب اتر گیا اور دنیا کے بیشتر محکوم ممالک 1945 اور 1950 کے درمیان آزاد ہو گئے۔ لیکن سرمایہ داری کا زوال نہیں ہوا۔ اس سے پہلے مختلف مغربی اجارداریوں کی ساجھے داری نے ملٹی نیشنل کارپوریشن کی شکل اختیار کی اور اس کے بعد سابق مقبوضات، خاص طور سے تیل پیدا کرنے والے ممالک کا سرمایہ اپنے ساتھ جوڑ کر ٹرانس کانٹی نینٹل کارپوریشنز کھڑی کیں۔ اب گلوبلائزیشن کا دور ہے جس کا ملّہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک ہے۔

اسی طرح تاریخ کے پس منظر میں پتہ چلا کہ روس کا انقلاب ان معنوں میں تاریخی نہ تھا کہ اس نے کسی نئے دور کا آغاز کیا۔ فرانسیسی انقلاب کے برعکس روسی انقلاب نے کوئی نیا طریقہ پیداوار متعارف نہیں کرایا۔ اور بقول مارکس نیا نظام صرف نیا طریقہ پیداوار ہی رائج کرتا ہے۔ روسی انقلاب ان معنوں میں تاریخی ہے کہ وہ اس دور کی آخری کڑی ہے جس کا آغاز برطانیہ کی چارٹسٹ تحریک کی شکل میں 1850 کے قریب ہوا تھا۔ اسی وقت کمیونیسٹ مینی فیسٹو بھی لکھا گیا جس میں کہا گیا کہ مزدوروں کے پاس علاوہ زنجیروں کے کھونے کو کچھ نہیں ہے۔

بہر حال روسی انقلاب نے مزدور کو بالادستی دے کر فطری صنعتی نظام کو غیر فطری بنا دیا۔ اور اس لیے وہ چل نہ سکا۔

میں امریکہ پر دہشت گردی کے حملے کو ایک بڑا جرم سمجھتا ہوں لیکن میرے خیال میں اسکا توڑ بمباری نہیں ہے۔ ملیٹری کے بجائے Diplomatic Initiative کی ضرورت ہے۔ ویسے بھی یہ ایک نئے قسم کی جنگ ہے جس میں کوئی کسی کی زمین پر قبضہ نہیں کرنا چاہ رہا ہے۔ تاریخ کا یہ جبر بڑا سبق آموز ہے کہ

دنیا کا ہر ڈیموکریٹ آج افغانستان میں ایک شاہ کی حکومت کا حامی ہے۔ میری بھی دعا ہے کے افغانستان کے اس اذیت کے لمحے میں ظاہر شاہ مسیحائی کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

آپ سے رخصت لینے سے پہلے میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کے مارکس کا میرے دل میں بہت احترام ہے ۔لیکن دنیا ۱۸۸۵ء پر رک نہیں گئی ہے۔ نئے دور کے تقاضوں کے لیئے نئے حل تلاش کرنا ہونگے ۔اس تلاش میں مارکس بھی مدد دیں گے، کرار صاحب بھی مدد دیں گے اور انسانیت کے دوسرے صوفی اور فلسفی بھی مدد دیں گے۔

☆☆☆

Published by :

Ad-Link Communications
0216622509, 6605155